# Faiz Ahmad Faiz:Glowing Metaphor Of Patriotism and Public Love

# فیض احمد فیض: حب الوطنی اور عوام دوستی کا روشن استعارہ

**Dr.Zeenat Afshan*[1]**
Post doctoral fellow،
IRI Department, International Islamic University, Islamabad

[1]☆ **ڈاکٹر زینت افشاں**

پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلو، آئی ار آئی ڈیپارٹمنٹ ، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام اباد

Correspondance: zeenat.afshan@fuust.edu.pk

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

**Received: 20-04-2025**
**Accepted:24-06-2025**
**Online:30-06-2025**

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: Faiz Ahmed Faiz is one of the most significant references in Pakistan's cultural life. His literary and poetic stature is undoubtedly acknowledged, and no one feels any disgrace in accepting that he is the most prominent poet of contemporary Urdu. Faiz Ahmed Faiz was not only a poet, but he also led a practical struggle to improve the lives of the Pakistani people. The struggle he participated in for the rights of the people went through arduous phases. As a result of this struggle, Faiz faced the hardships of unemployment, exile, and imprisonment with bravery. It is strange that some short-sighted and narrow-minded individuals question Faiz's patriotism. It is clear from his writings and his entire life that Faiz remained connected to his soil and his people until the very end. He chose a difficult life by renouncing comfort and luxury, but he did not shy away from the jihad to realize the dreams of making Pakistan a welfare state. This article attempts to provide an intellectual response to the recurring doubts about Faiz's patriotism.

KEYWORDS: .Faiz Ahmad Faiz, Poetry, Socialism, Marxism, Politics , Public Lover, Patriotism

اس حقیقت سے کسے انکار کی جرأت ہو سکتی ہے کہ فیض احمد فیض اردو کے عظیم شاعر ہیں مگر ان کی شخصیت اس وقت تک مکمل اور پوری نہیں ہو گی جب تک ان کے انقلاب آفریں سیاسی تصورات اور عملی جدوجہد کو ان کی شاعری کے ساتھ رکھ کر نہ دیکھا جائے۔ تاریخِ پاکستان کا تدریجی ارتقا سامنے رکھتے ہوئے ان کی نظموں اور غزلوں کا مطالعہ کریں تو فیض صاحب کی مکمل شخصیت سامنے آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فیض صاحب کی مکمل شخصیت قابلِ رشک حد تک بڑی اور غیر معمولی ہے۔

تحریکِ پاکستان، برصغیر کے مسلمانوں کی کئی سو سال کی غلامی سے چھٹکارے کی تحریک تھی۔ مسلمانانِ ہند اپنی تاریخ کے بدترین عذاب سے دوچار تھے۔ انہوں نے صدیوں پر محیط عرصے میں دو دشمن قوموں کے اس قدر ستم سہے کہ سوائے تقسیم کے کوئی اور راستا باقی نہ بچا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں تحریکِ پاکستان کا لشکر اپنی آزادی کی جنگ پوری قوت سے لڑ رہا تھا۔ فیض احمد فیض نے برطانوی فوج میں اعلیٰ افسری کا عہدہ ترک کیا اور ۱۹۴۶ء میں قائد اعظم محمد علی جناح کے ویژن کے مطابق انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کی ادارت سنبھالی۔ فیض احمد فیض قیامِ پاکستان کے وقت بھی ایک نام ور شاعر اور ممتاز دانش ور تھے۔ قائد اعظم کی نظرِ انتخاب فیض پر تھی لہٰذا انہوں نے اس اہم عہدے کے لیے ان کا تقرر کیا۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے حب الوطنی کے سلسلے میں فیض صاحب پر لگائے جانے والے الزامات کا تجزیہ کچھ یوں کیا ہے:

> ”یہ وہ شخص ہے جسے تحریکِ پاکستان کے ایک نازک مرحلے پر خود قائد اعظم نے پاکستان ٹائمز کا ایڈیٹر مقرر کیا تھا۔ اور جو تحریکِ پاکستان کے تہذیبی محاذ پر دادِ شجاعت دینے کی غرض سے برٹش انڈین آرمی کے ایک اعلیٰ عہدہ پر لات مار کر آیا تھا۔ فیض نے فوجی زندگی کے رعب داب اور آرام آسائش کو ترک کر کے صحافتی زندگی کے مصائب کو گلے لگانے کا مشکل فیصلہ کتنی آسانی سے کر ڈالا تھا۔“[1]

فیض صاحب نے رعب اور دبدبے والی نوکری چھوڑنے کا سبب بیان کرتے ہوئے وائسرائے لارڈ ڈویول کی اپریل ۱۹۴۶ء میں پنڈی دربار میں آمد اور کھانے کے دوران میں اس کی گفتگو کا حوالہ دیا ہے۔ انہوں نے اس واقعے کے بعد جو فیصلہ کیا، اسے ان الفاظ میں بیان کیا:

> ”میں ان دنوں راولپنڈی میں تھا جو ناردرن کمانڈ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس علاقے کے فوجی تعلقات عامہ کی نگرانی کر رہا تھا۔ حکامِ بالا اتنے باخبر نہ تھے اور ان

کی خفیہ کانفرنسوں میں بھی مجھے اور بعض سینئر ہندوستانی افسروں کو شامل کرایا جاتا تھا۔ اس سے دو تین باتیں واضح ہوئیں۔

اوّل: اس جنگ کے بعد انگریز اور امریکن اب شمالی خطرے یا سوویت روس سے جنگ کی پیش بندیاں کر رہے ہیں۔

دوم: انہیں ایک آزاد اور خود مختار پاکستان کا وجود میں آنا گوارا نہیں۔

سوم: اگر ہندوستان کو آزادی مل بھی جائے یا ہندوستان تقسیم بھی ہو جائے تو فوج کسی صورت میں تقسیم نہیں ہو گی اور اس کی کمان انگریزوں ہی کے ہاتھ رہے گی۔

اس کا سب سے واضح ثبوت اس بار ملا جب وائسرائے لارڈ ویول ۱۹۴۶ء کے مارچ یا اپریل میں راولپنڈی میں اپنا دربار کرنے آئے۔ دربار کے بعد کمانڈ کے سینئر افسر جی او سی جنرل ریس کے گھر کھانے پر بلایا گیا اور لارڈ ویول نے سیاسی حالات پر تبصرہ کیا.......... طوطا چشمی سنی تھی مگر اس کا مظاہرہ دیکھ کر ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی.......... ہم نے ٹھان لی کہ اب ہماری جنگ نئے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ ہندوستان کی مکمل آزادی، پاکستان کے قیام کی جدوجہد جزو ایمان ٹھہری۔ فوج سے کوچ کا وقت آ پہنچا۔"(۲)

تحریکِ پاکستان مسلمانانِ ہند کی آرزوؤں کا محور تھی۔ انہوں نے آزادی بلکہ مکمل آزادی کے ساتھ ایک مثالی ملک بنانے کے خواب دیکھے تھے۔ ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بن گیا لیکن دونوں جانب فسادات اور مہاجرین کے مسئلے نے سر اٹھایا۔ اس کے ساتھ جڑا ہوا قضیہ متروکہ جائیدادوں کا سامنے آیا۔ وہی لوگ جو پاکستان کو مسلمانوں کے لیے جائے امان سمجھ کر تحریکِ پاکستان کے ہر اول دستے میں دادِ شجاعت دے رہے تھے، جب آزاد ہوئے تو غلط طور پر سمجھا کہ یہی منزل ہے اور جدوجہد ترک کر دی۔ ایسے میں مفاد پرستوں اور ہوس پرستوں نے متروکہ جائیدادوں کو اپنے نام کرانے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرنا شروع کر دیے۔ زرعی اصلاحات کا منشور میں کیا گیا وعدہ تو جیسے کیا ہی نہیں گیا۔ ملک چلانے کے لیے تحریکِ پاکستان میں طے کیے گئے طریق کار سے انحراف کرتے ہوئے بیرونی بیساکھیوں کی جانب توجہ مبذول کر لی گئی۔ فیض احمد فیض کی بصیرت اتنی گہری اور بجا تھی کہ انہوں نے اس منظر نامے کو آزادی کے راستے کی دیوار سمجھا اور بیدار مغز ہونے کا ثبوت دیا۔ انہوں نے "صبحِ آزادی" جیسی نظم تخلیق کی۔ داغ داغ اجالا اور شب گزیدہ سحر بتانے کی دیر تھی کہ ستم ظریفوں نے فیض احمد فیض کی وطن سے محبت بلکہ عشق کو مشکوک قرار دے دیا حالاں

ک ہ فیض صاحب جو کہہ رہے تھے، وہ نظر بھی آ رہا تھا۔ فیض صاحب کی وطن سے محبت رجائیت اور امیدوں سے بھرپور تھی، سو وہ صبح آزادی نظم میں تحریکِ پاکستان کے کارکنوں کو سفر جاری رکھنے کی تلقین یوں کرتے ہیں:

"یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہو گا شبِ سُست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا، سفینۂ غمِ دل
ابھی چراغِ سرِ راہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی" (۳)

فیض صاحب ۴۔مارچ ۱۹۴۸ء کو روزنامہ امروز کے پہلے شمارے کے اداریے میں لکھتے ہیں:

"ہمارا نیا آزاد ملک ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہونے پایا تھا کہ اس پر یکے بعد دیگرے کئی پہاڑ ٹوٹے۔ لاتعداد مہاجرین کو بسانے کا کڑا کام سر پر آ پڑا۔ مشترکہ اموال و املاک کی تقسیم میں بے پناہ خسارہ اٹھانا پڑا۔ کشمیر کی خوبصورت زمین کو ہتھیانے کے لیے اغیار نے دستِ غصب بڑھایا، بسے ہوئے شہر اجڑ گئے، چلتے ہوئے کاروبار رک گئے۔"(۴)

دراصل فیض صاحب جمہوریت، معاشی اور معاشرتی انصاف پر کامل یقین رکھتے تھے، اس لیے آزادی کے جشن تک محدود رہنے کی بجائے کامل آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد جاری رکھنے پر زور دیتے رہے۔ فیض صاحب کا یہ خیال کہ تحریکِ پاکستان کو ابتدائی مرحلے میں مکمل سمجھنے کی غلطی کا نقصان ناقابل تلافی ہو گا، بالکل درست تھا۔ وطن سے محبت کا تقاضا تھا کہ تحریکِ پاکستان کو اس جذبے سے جاری رکھا جاتا۔ پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

"سلطانی جمہور، معاشی انصاف اور معاشرتی مساوات کے یہ تصورات فیض جیسے مجاہدوں کی پاکستانیت کے اٹوٹ انگ تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک قیامِ پاکستان کے ساتھ تحریک اپنی تکمیل کو نہ پہنچی تھی بلکہ ایک نئے اور اہم مرحلے میں داخل ہوئی تھی۔ یہ مرحلہ پاکستان میں ان تصورات کے عملی

ظہور کی کٹھن اور صبر آزما جدوجہد کا مرحلہ تھا جن کا پرچم اٹھا کر یہ تحریک
مقبول عوام ہوئی تھی۔ فیض نے قیامِ پاکستان کی خوشی میں کارکنان تحریکِ
پاکستان کا اپنا جہادِ آزادی تیز کر دینے کی تلقین کی:
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی"(۵)

اِدھر قائداعظم کی رحلت ہوئی، اُدھر عوامی آرزوؤں اور امنگوں کی بات کرنے والوں کو پاکستان کا دشمن اور غدار قرار دینے کا سلسلہ ایک آندھی کی طرح شروع ہو گیا۔ فیض صاحب مایوس نہیں ہوئے اور کہا:

"دل نا امید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
گردشِ فلک میں تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے"(۶)

پچاس کی دھائی کے وسط میں پاکستانی حکومتوں کی اکھاڑ پچھاڑ دیکھ کر فیض صاحب بہت بے چین اور ملول ہوئے۔ ان کے خیال میں اقتدار اور مال و منال کی بندر بانٹ کے رویے کے سبب تحریکِ پاکستان کی جاری جنگ سرد پڑتی نظر آ رہی ہے۔ انہوں نے اپنی نظم "اگست ۵۵" میں کہا:

"پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے"(۷)

فیض صاحب مشرقی پاکستان کے حالات کی سنگینی سے بجا طور پر خوف زدہ تھے اور قوم کو بار بار آگاہ کر رہے تھے۔ انہیں نظر آ رہا تھا کہ ایک ملک کے دو خطوں کے درمیان موجود جغرافیائی دوری اب دلوں میں بھی بڑھ رہی ہے اور موقع پرست و حکمران بندر بانٹ میں مصروف ہیں۔ مشرقی پاکستان کے حالات سے کوئی احمق ہی ناواقف ہو سکتا تھا یا لالچی اور مفاد پرست ٹولہ۔ ایسی صورت حال میں فیض صاحب سرِ وادی سینا میں شامل نظم "غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے" میں کہتے ہیں:

"کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آ لگے عمرِ رواں یا دل ٹھہر جائے
اماں کیسی کہ موجِ خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے
کوئی دم بادبانِ کشتیِ صہبا کو تہ رکھو

ذرا ٹھہرو، غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے
خمِ ساقی میں جز زہر ہلاہل کچھ نہیں باقی
جو ہو محفل میں اس اکرام کے قابل ٹھہر جائے
ہماری خامشی بس دل سے لب تک ایک وقفہ ہے
یہ طوفاں ہے جو پل بھر بر لبِ ساحل ٹھہر جائے
نگاہِ منتظر کب تک کرے گی آئنہ بندی
کہیں تو دشتِ غم میں یار کا محمل ٹھہر جائے''(۸)

ملک کے دونوں حصوں میں کھینچا تانی اور موقع پرستوں کی لوٹ مار نے عوام میں مایوسی اور بے بسی کے حالات کو دو آتشہ کر دیا۔ مشرقی پاکستان کی جانب سے بے چینی کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے۔ حالات جس تیز رفتاری سے خراب ہو رہے تھے، وہ فیض صاحب جیسے محب وطن اور حساس شخص کی نظر سے کیسے اوجھل رہ سکتے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے سانحے سے ذرا پہلے فیض صاحب مشرقی پاکستان کے حالات دیکھنے کے بعد ''شامِ شہر یاراں'' میں ''ڈھاکہ سے واپسی'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں گویا ہیں:

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد
کب نظر آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد
دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
ان سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد''(۹)

فیض صاحب اپنی جدوجہد میں اس قدر ثابت قدم رہے کہ معاشی تنگی، بیروزگاری، ملک بدری، حتیٰ کہ جیل کی صعوبتوں کو بھی گلے لگاتے رہے مگر عوامی خوابوں اور آرزوؤں کے قتل کے خلاف جدوجہد ترک نہیں کی۔ قیامِ پاکستان کے تیسرے برس گرفتار ہوئے اور پلٹ پلٹ کر مادرِ وطن اور اس کے عوام کے لیے جنگ میں ملوث ہوتے رہے۔ سقوطِ ڈھاکہ جیسے سانحے نے فیض صاحب کو توڑ کر رکھ دیا مگر پاکستان کی محبت انہیں کھینچ کر میدانِ جنگ میں لے کر آتی رہی۔ وہ

اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں بھی جمہوریت کے لیے جہاد کرتے رہے۔ ۱۹۷۷ء میں "شامِ شہر یاراں" میں "درِ امید کے دریوزہ گر" کے عنوان سے نظم میں لکھتے ہیں:

"پھر پھریرے بن کے میرے تن بدن کی دھجیاں
شہر کے دیوار و در کو رنگ پہنانے لگیں
پھر کف آلودہ زبانیں مدح و ذّم کی قمچیاں
میرے ذہن و گوش کے زخموں پہ برسانے لگیں
پھر نکل آئے ہوسناکوں کے رقصاں طائفے
دردمندِ عشق پر ٹھٹھے لگانے کے لیے
پھر دُہل کرنے لگے تشہیر اخلاص و وفا
کشتۂ صدق و صفا کا دل جلانے کے لیے
ہم کہ ہیں کب سے درِ امید کے دریوزہ گر
یہ گھڑی گزری تو پھر دستِ طلب پھیلائیں گے
کوچہ و بازار سے پھر چن کر ریزہ ریزہ خواب
ہم یوں ہی پہلے کی صورت جوڑنے لگ جائیں گے" (10)

سقوطِ ڈھاکہ (1971ء) کا سانحہ تو جیسے پاکستانیوں پر کوہِ گراں بن کر گرا۔ لوگ ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ پاکستان عالمی برادری کے سامنے بے توقیر ہوا تو ظاہر ہے کہ اس ملک کا کون سا باسی ہو گا کہ وہ بدحواس نہیں ہوا ہو گا۔ ڈاکٹر ایوب مرزا اس سانحے کے فوراً بعد فیض صاحب سے ملاقات کا احوال یوں لکھتے ہیں:

"فیض صاحب نظر نہ آئے تو میں سمجھا کسی غلط کمرے میں آ گیا ہوں، یہ فیض کا کمرہ نہیں ہو سکتا۔ باہر آ کر دوبارہ کمرے کا نمبر دیکھا، کمرہ وہی تھا۔ پھر دوبارہ اندر آ گیا، آہستہ سے آواز آئی، کون؟ میں نے کہا فیض صاحب آپ کہاں ہیں اور یہ بتیاں کیوں گل ہیں؟ ان کا سوئچ کدھر ہے؟ کہنے لگے بھئی ادھر ہی آ جاؤ اور سوئچ کسے معلوم کہاں ہیں۔ فیض بستر میں اوندھے لیٹے ہوئے تھے، سر چادر سے غرورِ جبیں کو چھپائے ہوئے تھے.......... میں نے عرض کیا فیض صاحب کوئی بات نہیں، آپ آج بھی اونچی رکھیں لو۔ کہنے لگے بھئی ہر تخریب میں تعمیر کا پہلو تو ضرور نکل آتا ہے لیکن اپنے گھر آپ خود مسمار کریں تو اس کی اذیت کبھی کبھی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ یہ

نہیں ہونا چاہیے تھا پاکستان کو یوں پامال ہوتا دیکھیں گے، یہ ہم نے سوچا تک
بھی نہ تھا۔''(۱۱)

آگے چل کر اسی تسلسل میں ڈاکٹر ایوب مرزا مزید لکھتے ہیں:

''میں نے فیض صاحب سے کہا آپ نے بھارت اور روس کے اقدامات کے خلاف جو بیان اخبارات کو دیا ہے وہ کس جذبے یا دباؤ کے تحت دیا ہے۔ کہنے لگے بھئی دباؤ وباؤ ہم نہیں مانتے اور نہ ہم پر کوئی دباؤ تھا۔ البتہ میرے ذہن پر اس المیہ کا بہت بوجھ تھا۔ جذبہ جو اس بیان میں کار فرما ہے، وہ تو میرے وطن کی سلامتی کا جذبہ ہے۔ بھئی اس معاملے میں بھارت اور روس دونوں کی روش وہ نہیں تھی جس کا عَلَم لے کر لینن نکلا تھا اور پھر ہم کوئی روس کے ملازم تو نہیں ہیں نا۔ بھئی اگر وہ غلط کام کریں گے تو ہم اسے ٹھیک کیسے کہیں۔ ہمارے لیے سب سے اوّل اپنی قوم اور اپنا ملک ہے۔''(12)

اس صورتِ حال میں فیض صاحب کی حب الوطنی کے بارے میں مزید کسی کھوج اور تجزیے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

فیض صاحب کی وطن سے محبت مثالی تھی۔ وہ کسی صورت، کبھی بھی وطن سے دور رہنے کو تیار نہیں ہوئے۔ بے حد حساس طبع اور نازک مزاج ہونے کے باوجود، جس طرح سے صعوبتیں برداشت کیں، اس کی ہماری تاریخ میں مثال نہیں ملتی، مگر رجائیت اور امید نے فیض صاحب کی شاعری اور فکر کو لازوال بنا دیا۔ دیکھیے اہلِ وطن کو دلاسا دیتے ہوئے کس طرح جدوجہد کے لیے تیار کر رہے ہیں:

''حلقہ کیے بیٹھے رہو اس شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے''(۳۱)

1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران میں فیض صاحب نے پاکستان کی فوجی حکومت کے ساتھ تعاون کا اعلان کیا تو بہت ہی عزیز دوست ایوب مرزا نے پھبتی کسی کہ فیض صاحب یہی وہ فوجی حکمران ہے، یعنی فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان، جس نے آپ پر بھارت نوازی کا الزام عائد کیا تھا۔ فیض صاحب نے ایوب مرزا کے اس طنز کا بہت برا منایا اور اپنی عادت کے برعکس شدید غم وغصے سے بھرا جواب دیا، ملاحظہ فرمائیے:

''ہم نے برملا فیض صاحب سے پوچھا، آپ کے نکتہ چیں آپ کو بھارت نواز کہتے ہیں اور اب ہم بھارت سے پنجہ لڑا چکے ہیں۔ فیض صاحب نے خلاف

معمول ہماری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ بھئی یہ کیا بکواس ہے............ ہم تمہاری
بات کا برا نہیں مانتے مگر تمہیں بھی غور کرنا چاہیے کہ اس پروپیگنڈے کا
مفہوم کیا ہے؟ میں اس قسم کے بے ہودہ پروپیگنڈے کو خاطر میں نہیں
لاتا۔ میں اس قسم کے فحش الزامات کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ ان کا جواب
بھی دیا جائے............ جب آپ کے وطن کے ناموس اور وجود پر حرف آئے
تو حب الوطنی کا تقاضا ہے کہ آپ اس کے دفاع میں شریک ہوں۔“(14)

1965ء کی جنگ کے حوالے سے یہ واقعہ بھی کم کم بیان ہوا ہے اور اس سلسلے میں معلومات بھی بہت کم ہیں۔ آغا ناصر، اپنی کتاب ”ہم جیتے جی مصروف رہے“ میں لکھتے ہیں:

”فیض صاحب ان دنوں کراچی میں تھے لیکن جب حکومت نے جنگ کی
پبلسٹی کے لیے ایک یونٹ بنائی اور ان (فیض صاحب) کو رس میں مشیر کی
حیثیت سے شامل کرنا چاہا تو وہ فوراً راولپنڈی پہنچے اور جنگ ختم ہونے تک
اس خصوصی یونٹ میں کام کرتے رہے۔“(15)

وطن پر آنچ آنے کی صورت میں فیض صاحب کے جذبات کسی پاکستانی فوجی یا شدید جذباتی پاکستانی سے کسی صورت کم دکھائی نہیں دیتے۔ ایسی صورت میں فیض صاحب کی نہ تو کوئی ذاتی انا آڑے آتی ہے نہ ہی کوئی مصیبت و صعوبت ان کے وطن کی محبت سے لبریز جذبات کے آگے بند باندھنے میں کامیاب ٹھہرتی ہے حالاں کہ یہ ایذائیں اور صعوبتیں انہیں حکمرانوں کی جانب سے پہنچائی گئی تھیں۔ دراصل فیض صاحب ایک باشعور پاکستانی ہونے کے ناتے یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ پاکستان کے عوام کے حقوق محفوظ نہیں ہیں اور یہ ملک تو دراصل انہیں محروم اور لاچار پاکستانیوں کا ہے۔ ایسی صورت میں فیض صاحب جیسے صائب الرائے اور قیادت کی صلاحیتیں اور سمجھ بوجھ رکھنے والے بھی اگر نچلے بیٹھ جائیں یا میدان سے بھاگ جائیں تو سدھار کب پیدا ہو گا اور محروم و لاچار عوام کے دن کب پھریں گے؟ فیض صاحب نے اسی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے وطن اور اہلِ وطن کی محبت میں امید کا چراغ مسلسل جلائے رکھا۔ دیکھیے اپنے اس کردار اور رویے کے بارے میں کس قدر واضح مؤقف رکھتے ہیں:

”کرتے ہیں جس پہ طعن کوئی جرم تو نہیں
شوقِ فضول و الفتِ ناکام ہی تو ہے
دلِ مدعی کہ حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے
دل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے

لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے" (16)

فیض صاحب کی رجائیت اور اچھے مستقبل کے خوابوں کا نظریاتی تانا بانا ہوا میں نہیں بُنا گیا تھا، وہ شعوری طور پر یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان ایک باصلاحیت ملک ہے اور پاکستانی عالمی برداری میں اپنی ایک الگ شناخت اور پہچان رکھتے ہیں۔ فیض صاحب کے زمانے میں بھی گاہے گاہے شناخت کا بحران سر اٹھاتا رہا ہے اور پاکستانیوں کا یقین اور اعتماد متزلزل کرنے والے افراد اور رویے موجود تھے۔ اسی بحران کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے فیض صاحب نے کہا تھا:

> "موہنجوڈارو سے لے کر مسجد اورنگ زیب بلکہ مزارِ اقبال تک، کے ٹو سے لے کر کاکس بازار تک (ان کے پاکستانی نام کب رکھے جائیں گے؟) سوات کے چوبی الواح مزار سے لے کر چٹا گانگ کے قبائلی کھیلوں تک اپنی سرزمین، فنون اور مناظر سے کوئی ایسی دس بیس حسین چیزیں چن لیجیے جنہیں آپ کسی اجنبی کے سامنے رکھ سکیں اور کہہ سکیں کہ دیکھو برادر یہ ہم ہیں یہ ہندوستان نہیں ہے اور افغانستان بھی نہیں ہے۔ یہ نہ ایران ہے اور نہ توران، نہ عرب ہے نہ عجم۔ یہ سب کچھ جو تم دیکھتے ہو پاکستان ہے۔ یہ دیکھو یہ سوات کا چغہ ہے، یہ سندھ کی اجرک ہے، یہ پشاوری حقہ ہے، یہ بہاولپور کی صراحی ہے، یہ سہلٹ کی چٹائی ہے اور یہ کومیلا کی پنکھیا۔ یہ درّہ خیبر ہے، یہ شالامار، یہ شاہ رکن عالم کا مزار ہے، یہ سات گنبدوں والی مسجد ہے۔ یہ چیل اور دیودار کے پیڑ ہیں، یہ چھالیہ اور بانس کے جھنڈ، یہ سرسوں کے کھیت ہیں، یہ مشاعرے کی محفل ہے، یہ چراغوں کا میلہ ہے۔ یہ عمارتیں یہ کھنڈر، یہ وادی، یہ صحرا، یہ کھیل تماشے، یہ خشوع و خضوع، یہ نوادر یہ دستکاریاں، یہ سب چیزیں ہماری ہیں، یہ سب کچھ ہم ہیں اور ہم پاکستان ہیں۔" (17)

فیض صاحب کی زندگی کا کٹھن اور مشکل سفر دراصل ان کا اپنا انتخاب تھا۔ اپنے ملک سے محبت نے انہیں تمام زندگی بے چین رکھا۔ وہ کبھی بھی حالات کی تلخی سے گھبرائے نہیں۔ جیلیں کاٹیں، روزگار گنوایا، متاعِ لوح و قلم بار بار چھنتی رہی، آسودگی کبھی قریب نہیں پھٹکی اور تو اور بار بار غریب الوطنی کے تھپیڑے سہنے پڑے مگر فیض صاحب کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ فیض صاحب کو سوویت یونین میں اقامت اختیار کرنے کی پیش کش ہوتی رہی اور اسی

طرح کی صورتِ حال میں ڈاکٹر ایوب مرزا کے ایک سوال کے جواب میں طویل تاریخ بیان کی مگر بیچوں بیچ پتے کی ایک خاص بات بھی کہہ گئے:

"یہ ناممکن ہے کہ آپ اپنے عوام سے ناطہ توڑ کر چین کی بانسری بجا سکیں۔
اپنے لوگوں میں جینا مرنا، ان کے لیے کچھ کرنا اصل حیات ہے۔"(18)

پاکستان کی خدمت کے راستے میں کوئی رکاوٹ یا کوئی دیوار فیض صاحب کو روک نہیں سکی۔ فوجی اور سول حکومتیں فیض صاحب کی خدمات حاصل کرتیں تو فیض صاحب عوام کی خدمت کے لیے بغیر کسی تذبذب کے پھر کمربستہ ہو جاتے۔ ظاہر ہے کہ فیض صاحب کی خدمات کا محور چوں کہ پاکستان کے لاچار اور غریب عوام تھے لہٰذا حکمرانوں کے لیے انہیں زیادہ دیر برداشت کرنا ممکن ہی نہ ہوتا۔ اس سلسلے میں حکمرانوں کی تخصیص فوجی حکمرانوں تک محدود نہیں تھی بلکہ عوامی نمائندگی کے دعویدار جمہوریت کے علم بردار سیاست دانوں کا دامن بھی فیض صاحب کے حوالے سے ویسا ہی داغ دار ہے۔ ایسی مایوس کن صورتِ حال سے مجبور ہو کر فیض صاحب لندن میں جابسے مگر طبیعت کی بے چینی، وطن اور اہلِ وطن کی محبت کے سبب وہاں کی آسائشوں بھری زندگی میں بھی کوئی کشش باقی نہ رہی۔ بیٹی منیزہ کے اصرار پر فیض صاحب کا جواب ملاحظہ کیجیے:

"اب لندن میں آرام سے بسر اوقات ہو رہی تھی۔ بظاہر کوئی بے چینی نہیں
تھی۔ ابو بے قرار رہتے تھے۔ مجھے ان کی بے قراری پسند نہ تھی۔ ابو سے
پوچھا آپ پریشان کیوں رہتے ہیں؟ کہنے لگے میں وطن واپس جاؤں گا۔
میں آنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ تعلیم حاصل کر رہی تھی اور نئی سہیلیوں
میں گھل مل گئی تھی۔ ابو سے پوچھا آپ کیوں جانا چاہتے ہیں؟ کہنے لگے مجھے
وطن ہی لوٹ جانا ہے۔ میرا جینا مرنا وہیں ہے۔ ابھی یہ بات تمہاری سمجھ میں
نہیں آئے گی۔"(19)

دراصل فیض صاحب کی وطن سے محبت ناقابل شکست اور ناقابل تقسیم تھی۔ اس سلسلے میں ان کی تمام زندگی خاص طور پر ان کی زندگی کے آخری زمانے کا ایک ایک پل حبِ وطن اور محبتِ اہلِ وطن کے لیے صرف ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ پاکستان کی تہذیبی زندگی پر فیض صاحب کے اثرات بہت گہرے اور دیرپا ہیں۔ پاکستان اور پاکستانیوں سے فیض صاحب کی ناقابل شکست محبت ایسی پختہ ہے کہ وہ مایوس نہیں ہوتے اور کسی انقلاب کے لیے اہل وطن کو تیار کرتے نظر آتے ہیں، ملاحظہ کیجیے "دستِ صبا" میں شامل یہ "ترانہ" فیض صاحب کے حبِ وطن، حبِ اہلِ وطن اور قومی دردمندی کے علاوہ عوام و ملک کی تقدیر بدلنے کے لیے رجائیت اور کامل یقین کیسے انقلاب کی راہ ہموار کر رہا ہے:

"دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے

کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے“(20)

فیض صاحب کی شاعری، صلیبیں مرے دریچے میں، میں شامل ایامِ اسیری کے 135 خط، فیض بہ نام افتخار عارف، مرتبہ ڈاکٹر راشد حمید میں شامل 38 خط، ڈاکٹر عمران ظفر کے مرتبہ درجنوں خط، فیض کے نایاب خطوط، ڈاکٹر محمد منیر سلیچ کی مرتبہ نوادراتِ فیض میں شامل متعدد خط اور دوسری تحریریں، فیض صاحب کی یادوں کا مجموعہ ماہ و سالِ آشنائی، فیض صاحب کے مضامین کا مجموعہ میزان، سید مظہر جمیل کی مرتبہ ایلس فیض کی کہانی اور فیض صاحب کی سوانح عمری ”ذکرِ فیض“ اور علی مدیح ہاشمی کی فیض صاحب کے بارے میں کتاب ”مہر و وفا کے باب“ درجنوں دوسری کتابیں اور تحریریں فیض صاحب کی اپنی مٹی اور اپنے لوگوں سے محبت اور عشق کی بے مثال شہادتیں اور گواہیاں ہیں۔ کاش ہم اپنے بڑوں کے احسانات کا اعتراف بروقت کرنے کی روش اپنا لیں۔

## حوالہ جات


1. ایوب مرزا، ڈاکٹر، ہم کہ ٹھہرے اجنبی، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، 1996ء، ص 77–78۔
2. فیض احمد فیض، نسخہ ہائے خطا، لاہور: مکتبہ کارواں، س ن، ص 116–118۔
3. عبداللہ ملک (مرتب)، لاؤ تو قتل نامہ مرا، لاہور: مکتبہ عالیہ، 1982ء، ص 50۔
4. فتح محمد ملک، پروفیسر، فیض: شاعری اور سیاست، لاہور: مکتبہ عالیہ، س ن، ص 55–56۔
5. فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، لاہور: مکتبہ کارواں، س ن، ص 257۔
6. ایضاً، ص 482۔
7. ایضاً، ص 460–461۔
8. ایضاً، ص 527۔
9. ایضاً، ص 543–544۔

10. ایوب مرزا،ڈاکٹر،ہم کہ ٹھہرے اجنبی،اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،1996ء،ص274–275۔
11. ایضاً،ص275۔
12. فیض احمد فیض،نسخہ ہائے وفا،لاہور:مکتبہ کارواں،س ن،ص687۔
13. ایوب مرزا،ڈاکٹر،ہم کہ ٹھہرے اجنبی،اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،1996ء،ص231۔
14. آغا ناصر،ہم جیتے جی مصروف رہے،لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،2008ء،ص164۔
15. فیض احمد فیض،نسخہ ہائے وفا،لاہور:مکتبہ کارواں،س ن،ص256–257۔
16. فیض احمد فیض،پاکستان کہاں ہے؟،مشمولہ :افکار(فیض نمبر)،مرتبہ:صہبا لکھنوی،کشش صدیقی،کراچی:مکتبہ افکار،1965ء،ص684–685۔
17. ایوب مرزا،ڈاکٹر،ہم کہ ٹھہرے اجنبی،اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،1996ء،ص215۔
18. ایضاً،ص102–103۔
19. فیض احمد فیض،نسخہ ہائے وفا،لاہور:مکتبہ کارواں،س ن،ص138۔
20. ایضاً،ص190۔

Refrences:

1. Ayub Mirza, Dr. *Hum Ke Thehre Ajnabi.* Islamabad: Dost Publications, 1996, pp. 77–78.
2. Faiz Ahmad Faiz. *Nuskha Haye Khata.* Lahore: Maktaba-e-Karwan, n.d., pp. 116–118.
3. Abdullah Malik (Ed.). *Lao to Qatl Nama Mera.* Lahore: Maktaba Alia, 1982, p. 50.
4. Fatah Muhammad Malik, Prof. *Faiz: Shaairi aur Siyasat.* Lahore: Maktaba Alia, n.d., pp. 55–56.
5. Faiz Ahmad Faiz. *Nuskha Haye Wafa.* Lahore: Maktaba-e-Karwan, n.d., p. 257.
6. Ibid., p. 482.
7. Ibid., pp. 460–461.
8. Ibid., p. 527.
9. Ibid., pp. 543–544.
10. Ayub Mirza, Dr. *Hum Ke Thehre Ajnabi.* Islamabad: Dost Publications, 1996, pp. 274–275.

11. Ibid., p. 275.
12. Faiz Ahmad Faiz. *Nuskha Haye Wafa*. Lahore: Maktaba-e-Karwan, n.d., p. 687.
13. Ayub Mirza, Dr. *Hum Ke Thehre Ajnabi*. Islamabad: Dost Publications, 1996, p. 231.
14. Agha Nasir. *Hum Jeete Ji Maroof Rahe*. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2008, p. 164.
15. Faiz Ahmad Faiz. *Nuskha Haye Wafa*. Lahore: Maktaba-e-Karwan, n.d., pp. 256–257.
16. Faiz Ahmad Faiz. "Pakistan Kahan Hai?", in *Afkar (Faiz Number)*, ed. Sahba Lakhnavi & Kashish Siddiqi. Karachi: Maktaba-e-Afkar, 1965, pp. 684–685.
17. Ayub Mirza, Dr. *Hum Ke Thehre Ajnabi*. Islamabad: Dost Publications, 1996, p. 215.
18. Ibid., pp. 102–103.
19. Faiz Ahmad Faiz. *Nuskha Haye Wafa*. Lahore: Maktaba-e-Karwan, n.d., p. 138.
20. Ibid., p. 190.

**Bibliography:**

Faiz, A. A. *Nuskha Haye Khata*. Lahore: Maktaba-e-Karwan, n.d.

Faiz, A. A. "Pakistan Kahan Hai?" In *Afkar (Faiz Number)*, edited by Sahba Lakhnavi and Kashish Siddiqi. Karachi: Maktaba-e-Afkar, 1965.

Malik, A. (Ed.). *Lao to Qatl Nama Mera*. Lahore: Maktaba Alia, 1982.

Malik, F. M. *Faiz: Shaairi aur Siyasat*. Lahore: Maktaba Alia, n.d.

Mirza, A., Dr. *Hum Ke Thehre Ajnabi*. Islamabad: Dost Publications, 1996.

Nasir, A. *Hum Jeete Ji Maroof Rahe*. Lahore: Sang-e-Meel Publications, 2008.